eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

CC BY
OPEN ACCESS

رضوانہ نقوی
لیکچرر اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین، جلال پور شریف، جہلم
ڈاکٹر نازیہ یونس
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
Rizwana Naqvi
Lecturer Urdu, Govt Associate College for Women, Jalal Pur Sharif, Jhelum
Dr. Nazia Younis
Assistant Professor, Dept. of Urdu, National University of Modern Languages, Islamabad

غیر روایتی شاعری میں عباس اطہر کا اختصاص

Abbas Athar's Description in Unconventional Poetry

Abstract:

Urdu poetic era of 1960 is distinguished due to revolutionary changes, where many waves of poetical variedness diversify the prospect of Urdu poetry. The movement of " New Poetry" demanded the new lexicon and style of writing for its poetic declaration so the destruction of determined traditional standers was presuppose and the "New Poets" did it." New Poets" wanted to express their art in quite new and unconventional way, so they set the example of unadorned style of writing with their poems. Abbas Athar is a popular poet of new poetic guise, his poetry is a quip against traditional poetic declaration. His poems demonstrate a special philosophy about human and society.Man's intricacies, labyrinths, accidents, violence and exertion for his eternity manifested by him in most weird way. The focus point of his poems is the man & society, where he focus upon man's puzzeldom and society's perplexity. In his poems he criticized & sneer on the dogma of society, his poetry is a chirography of unconventional poetic disclosure which expose the new doors of poetic modification.

Key Words: Abbas Athar, New Poetry, Lexicon, Philosophy, Unconventional, Tradition

کلیدی الفاظ: عباس اطہر، نئی شاعری، لغت، اسلوب، فلسفہ، غیر روایتی

اردو زبان میں نظم کا سفر صدیوں پر محیط متعدد مراحل اور نشیب و فراز سے دوچار رہا ہے۔ روایتی معنوں میں نظم سے مراد وہ صنفِ سخن تھی کہ جس کے خارجی و داخلی اجزاء تشکیلِ نظم میں زندہ کردار ادا کرتے ہوئے اس کی تعمیر و تشکیل میں برابر کے شریک ہو کر ایک ایسی لفظی صورت کو سامنے لائیں کہ جس کا ہر جزو کل سے ہم آہنگ اور زندہ نامیاتی دھاگوں سے بندھا ہو، یعنی شاعر کا جذبہ، مشاہدہ، احساس، ادراک اور تخیلی حسیات مرکب جمالیاتی صورت میں ڈھل کر ایک ایسی مکمل ہیت کو سامنے لائیں کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں برق کوند جائے اور شاعر کے فن کی روشنی قاری کے دل و دماغ کو روشن کرتی ہوئی اسے روحانی تسکین اور

علویت عطا کر جائے۔ نظم کا یہ آفاقی تصور ایک عرصہ سے دیگر زبانوں کے شعر وادب کی طرح اردو زبان میں بھی رائج رہا مگر عہدِ جدید نے جہاں زمانے کی دیگر اقدار کو بدلا وہیں شعری و فنی سانچوں میں تغیر رونما ہوا۔ چنانچہ عہدِ جدید میں نظم ایک آزاد پیکرِ فن وخیال ہے کہ جس کی وسعت لامتناہی اور اس کی انفرادیت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ روایتی قاعدوں، سانچوں اور کلاسیکی تقلید و تکرار سے دامن بچا کر عہدِ جدید کے آشوب اور اس کی صورتحال کی نمائندہ بنتی ہے۔ جب عہدِ جدید کا رویہ، اظہار، صورتحال اور ردعمل مختلف ہے تو لامحالہ طور پر جدید شاعر کا شعری قرینہ، فکر اور مواد بھی ماضی سے مختلف اور منفرد ہو گا۔ ڈاکٹر حامد کاشمیری کے نزدیک:

> ”نظمِ جدید اس اعتبار سے موجودہ دور کا نیا شعری قالب ہے کہ یہ ایک بالکل نئی صنف ہے، اسکی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تغیر پذیری کی صلاحیت رکھتی ہے اس میں جامعیت، وسعت اور لچک ہے۔ یہ کسی ایک سمت کا نام نہیں ہے اس کے سانچے معیّن اور مقررہ اصولوں کے تحت نہیں بنائے جاتے۔ اس کے اوزان بھی مقرر نہیں ہیں، اس لیے کہ یہاں نہ موضوع ہی پہلے سے مقرر ہے نہ ہیت ہی کی کوئی قید ہے بلکہ موضوع خود ہی اپنی ہیت تراش لیتا ہے۔“ (۱)

عباس اطہر کا نام جدید اردو شعرا میں اپنے غیر روایتی فن، شعری پیمانوں، ہیت و صنفی انفرادیت، فکری وسعت و حسّیت اور لسانی اظہار کے انوکھے پن کی بناء پر ممتاز و منفرد ہے۔ ان کا منظوم سرمایہ جس نوع کی جدت و انفرادیت سے عبارت ہے اردو کا کوئی اور شاعر اس سے لگا نہیں کھاتا۔ ان کی نظمیں اپنی فنی حیات کے لیے ہر مرتبہ اک نئے شعری باطن کی تخلیق کرتی ہیں۔ ان کا اوّلین مجموعہ "دن چڑھے دریا چڑھے" اردو کے شعری ایوان میں نا صرف غیر روایتی منفرد اظہار کی پکار ہے بلکہ انہوں نے اظہارِ فن کے لیے جس نوع کی تازگی پیدا کی ہے، تلازماتی وسعتوں وزاویوں کے استعمال سے لسانی، منطقی، معروضی وہیتی زاویوں کو جو فروغ بخشا ہے وہ انھی کا خاصا ہے۔ "دن چڑھے دریا چڑھے" غیر روایتی شعری اظہار کا ہی نہیں بلکہ زبان کے نئے شعری باطن کی دریافت کا عمل بھی ہے۔ عباس اطہر کا فنی اظہار فقط اپنی شناخت کا متقاضی ہی نہیں بلکہ اردو شاعری کے اس فنی رویے کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے کہ جہاں ایک عرصہ سے مستعمل شعری، فکری و فنی قرینے مسلسل استعمال سے بے جان، بے کیف اور بے معنی ہو چکے تھے مگر اردو شاعری کے نام پر اب بھی چبائے ہوئے لقموں کی جگالی جاری تھی ایسے میں انہوں نے نا صرف پامال رستے کو اختیار کرنے سے انکار کیا بلکہ اک نیا فنی راستہ کھوج کے ہم عصر اور آنے والے شعرا کو نئے شعری افق تک رسائی بھی فراہم کی۔ عباس اطہر کی نظموں کا شعری باطن مروجہ شاعرانہ نثر اور منظوم نثر سے کوسوں دور ایک منفرد اور اچھوتے شعری، فکری اور اسلوبیاتی آہنگ سے مزین ہے۔ ان کی ہر نظم ایک مکمل فکری کائنات کی لفظی تصویر ہے جس میں شاعر کا تجربہ، احساس، عصر اور اجتماعی انسانی تہذیب سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا فکری تغیر جب کروٹ لیتا ہے تو شعری تجربہ ان کے داخل کے آتش کدے میں کندن بنتا ایک پر اسرار تخلیقی عمل کے تحت موزوں ترین لسانی قالب میں ڈھل کر اصلی انسانی صورتحال کو آئینہ کرتا ہے۔

عباس اطہر کا سب سے پہلا شعری مجموعہ 1963ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ شعری مجموعہ جذباتی و فکری حوالے سے ان کے فنی سفر میں تشکیلی دور سے عبارت ہے۔ اس مجموعے کے بعد آنے والے شعری و فکری سرمائے میں شاعر کا جذباتی و احساساتی تغیر و تبدل واضح ہے مگر ان کی اسلوبیاتی و فکری انفرادیت اوّل تا آخر اپنا نقش برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بقول انیس ناگی:

> ”عباس اطہر کی نظمیں چونکا دینے کی حد تک غیر معمولی ہیں اس کا انسانی صورتحال کے بارے میں ردِ عمل پرانی شرافتوں کے حوالے سے گستاخ اور بے حجاب ہے۔“(۲)

عباس اطہر کی نظموں میں رائج الوقت اقدار سے تصادم، معاشرتی بدحالی اور تشدد سے جنم لینے والے غیر فطری اظہار کی صورتیں بہت واضح ہیں۔ فرائیڈ انسانی سماج میں تہذیب و تمدن کو آسودگی کے راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ جانتا ہے۔ فرائیڈ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ "کیا انسان کی تخلیق کردہ تہذیب آسودہ انسانیت کی ضامن ہے؟" اس سوال کا جواب فرائیڈ مقصدِ حیات کے اعلیٰ نظریات سے ہٹ کر انسانی کردار میں ڈھونڈتا ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک انسان زندگی سے جس چیز کا سب سے زیادہ آرزومند ہے، وہ آسودگی ہے اور یہ آسودگی شدید فطری خواہشات کی تسکین سے حاصل ہوتی ہے۔ جب ان خواہشات کے راستے میں سماج، قانون یا اقدار رکاوٹ بنتے ہیں تو فرد کی زندگی مصائب و آلام سے دوچار نظر آتی ہے۔ فرائیڈ کے ہاں ذاتِ انسانی کے بنیادی آلام میں وجودِ انسانی کی فنا، خارجی دنیا کا جبر اور آزدانہ باہمی تعلقات میں رکاوٹیں اور الجھاؤ بنیادی مسئلہ ہیں۔ عباس اطہر کی نظموں میں یہی جذباتی، نفسیاتی اور فکری الجھاؤ نیز تہذیبی طوائف الملوکی اور خواہشاتِ انسانی کی کچلی ہوئی صورتیں جابجا ابھرتی ہیں اور جنس اور تشدد کے حوالے سے عصرِ حاضر کا نوحہ کہتی ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے مطابق:

> "ان کے ہاں جنس کے استعارے فرائیڈ اور ڈی ایچ لارنس کے تصورات و نظریات کے اشتراک سے قوت حاصل کرتے ہیں۔۔۔ عباس اطہر نے ان کے علاوہ یونگ کے اجتماعی لاشعور کے میلانات اور جدید مصوری میں موجود شعور کے بہاؤ اور آزاد تلازم کی تکنیک سے بھی استفادہ کیا ہے۔ وہ نئے سائنسی معاشرے کے انتشار کی بڑی جرات مندانہ طریقے سے عکاسی کرتے ہیں۔" (۳)

عباس اطہر کے ہاں تہذیب اور اس کا مفہوم مروجہ شعری روایت سے مختلف اور جدید نفسیاتی رجحان کا نمائندہ ہے۔ ان کے نزدیک تہذیب سماجی اداروں کی ذہنی فتوحات کا نچوڑ ہے جو انسان اور حیوان میں ایک واضح لکیر کھینچ کر انسانیت کو فطرت سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے اور یوں وہ انسان کے آپسی تعلقات کی تنظیم کرتی ہے لیکن یہ تنظیم انسانی سماج کو تحفظ و تسکین دینے کی بجائے عدمِ تحفظ اور بے چینی سے دوچار کر رہی ہے۔ ایسے میں تہذیبی ارتقاء بشری تسکین و ترقی کی بجائے خود انسان کے جبلی رجحانات کا دشمن ہے کیونکہ جبلی رجحانات کی تسکین ہی درحقیقت انسانیت کی تسکین ہے۔ عباس اطہر بھی تمدنی و ریاستی حدود و قیود کو انسانی حیات کی تسکین میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں خواہشات اور ان کی تشنگی پر بار بار صدائے احتجاج بلند ہوتی۔ جدید ماہرینِ نفسیات کے نزدیک حیاتیاتی ضرورتوں میں افزائشِ نسل اور بقاءِ ذات کی جبلتیں اوّلیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ایک صحت مند انسانی وجود اور معاشرے کے لیے ان کی تشفی لازم ہے۔

عباس اطہر ذہنی پسماندگی، سماجی الجھنوں، ابتری اور ہر روز بڑھتی ہوئی انسانی وحشت کو بشر کے نفسیاتی عوارض کا منبع جانتے ہیں۔ اور ان عوارض میں سب سے بڑا مرض جنسی تشنگی ہے۔ جنسی تشنگی کی تشفی کا سب سے آسان حل اسلام نکاح اور کثرتِ ازدواج کی صورت پیش کرتا ہے گر اسے سہل اور قابلِ دسترس بنالیا جائے تو سماجی اور جنسی ہر نوع کی گھٹن کا علاج ممکن ہے۔ جنسی جھجک اور جنسی تشفی کے حوالے سے سماج کے کھوکھلے قوانین و اقدار انسانوں کی بیمار ذہنیت کی سب سے بڑی وجہ ہیں اسی بناء پر سماج کیچڑ سے لت پت اور متعفن ہے اور وہ اس سماج کی بقا اور انسانی سالمیت کے لیے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور کبھی یہ احتجاج آہ اور تاسف کی صورت ڈھل کر زمانے کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔

اجنبی منڈیر سے آگے نکل جاؤ
کنواں، دھند اور دھواں اور گھنٹیاں

گھنٹیاں بجتی رہیں گی
میں ہمیشہ دیر سے جاگوں گا
شاید نیند مجھ سے دور بھاگے اور میں اگلے قدم کا بھید پا جاؤں
مگر دھند اور دھوئیں کے فاصلوں میں
اجنبی آواز ہے: تم دیر سے جاگے ہو لڑکے
مرد اور گھوڑے کے پاؤں پیٹ میں ہیں۔(۴)

دراصل وہ انسان کو اپنے ہی تخلیق کردہ سماجی رویوں سے جو جتا دیکھتے ہیں تو انسانی تہذیب و تمدن کو اس کا ذمہ دار گردانتے ہیں انھیں انسانی سماج کی بنیادوں میں جا بجا خواہشات کا لہو نظر آتا ہے کیونکہ ارتقاءِ تمدن میں اہم ترین عنصر انسانی احساسِ جرم ہے اور اسی کی بیداری تہذیب و تمدن کی ترقی کی ضامن ہے مگر یہ رکاوٹیں اور احساسِ جرم سماج کو تو بڑھاوا دیتا ہے لیکن انسانوں کے درمیان دوریوں کی لکیر کھینچتا چلا جاتا ہے۔ جدید علوم و رویوں کے تناظر میں آزاد نفسی، قلبی تعلقات کی فراوانی گو سماجی اصول و قوانین کی دشمن ہے مگر یہی دشمنی درحقیقت اجتماعی انسانی تسکین کی ضامن ہے۔ اس صورتحال کے تناظر میں زرپرست صنعتی معاشرے نے انسانوں کے درمیان جس بُعد کو فروغ دیا ہے اس کے نتیجے میں عباس اطہر کو دھرتی بانجھ نظر آتی ہے اور دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں بھی تخلیقی قوتوں سے محروم اور حقیقی خوشیوں سے عاری معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے میں ان کی نظمیں بند دروازوں، بلند و بالا دیواروں اور محبس کی صورت میّسر پناہ گاہوں کے اشارے میں جنسی و جذباتی گھٹن کو بیان کرتی ہیں۔ عباس اطہر سماجی اقدار کے تصادم کی مروجہ سطح کو قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ افتخار جالب کے نزدیک:

> "بند شخصیتیں زندگی میں سب کچھ چوری چھپے قبول کرنے کے باوجود مشتعل ہوتی ہیں ان سے کھلے بندوں اپنا آپ دیکھا نہیں جاتا اس مواد کو حرمتوں کی شکست و ریخت کے بعد ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ جن کی ذات حرمتوں کے خلاف ردِّعمل کی آہٹ سے تھر تھر کانپنے لگتی ہو ان کیلیے حرمتوں کے اڑا اڑا دھم گرنے کا دھچکا ناقابلِ برداشت اور مواد کے ہوشربا رشتے اور بندھن ناقابل فہم نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے؟"(۵)

عباس اطہر کی نظمیں روایتی نظم کے حسن و نزاکت کو نہیں قبولتیں بلکہ وہ اپنے اردگرد بکھری موت اور برہنگی کو اپنی ذات کے معروضی تجربے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ عہدِ حاضر کا جبر، تنہائی اور کھوکھلے نظام انہیں جوتے کے کنکر کی طرح اذیت دیتے ہیں اور انسانیت کی راہ کھوٹی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں کا فرد مروجہ کھوکھلی حرمتوں کا پاسدار نہیں بلکہ حقائق کا علمبردار ہے اور اس سفر میں شاعر اس کا ہمسفر و غمگسار ہے۔ وہ اپنی نظموں میں فرد کی جس ذات کو پیش کرتے ہیں وہ عہدِ جدید کا محروم انسان ہے۔ تنہائی اسکی ذات کا کل ہے اور یہی تنہائی نئی معنویت کا استعارہ بھی ہے۔ یہ تنہائی فرد بھی ہے، سماج بھی اور خود شاعر بھی یہ کسی ایک ذات سے مختص نہیں بلکہ عہدِ جدید کی حیات اور اسکی پیشکش کا استعارہ ہے۔ وہ اپنی نظموں میں فرد و سماج کے باہمی انسلاک، عمل و ردِعمل، بشر کی ذات اور اسکے داخلی کوائف میں معروضی صداقتوں کو تلاش کرتے ہوئے درحقیقت انسان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی سعی کرتے ہیں کیونکہ خارجی حقائق و واردات گریز پا ہیں۔ ایسے میں بشر کی قدر و قیمت داخلی ردِعمل ہی متعین کر سکتا ہے۔ ان کے ہاں فکری، جذباتی اور تہذیبی طوائف الملکو کی داستانوں کے اشارے جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں لاقانونیت، بدلتی ہوئی اقدار اور حرص و ہوس کی یہ دھرتی جنس، تشدد اور خون خرابے کے حوالے سے ان کے ہاں بار بار جھلک دکھاتی ہے اور برہنگی اور موت کی آہٹ قدم قدم پر اپنی موجودگی کا احساس دیتی ہے مگر ان کے ہاں جنس محض لذت اور موت محض دہشت نہیں ہے بلکہ

مروجہ حیات کی حقیقت ہے اسی بناء پر انتقام، آزار، بدنامی اور سیاہ نصیبی کے جلوے ان کی نظموں میں جس منظر نامے کی تشکیل کرتے ہیں وہ اپنی معنویت اور انفرادیت میں خاص الخاص ہے۔

"ہمارے کھیتوں کو غیر ملکی ٹریکٹروں نے نیا کیا ہے
فی ایکڑ پیداوار بڑھ گئی ہے
تمام شہروں میں میلے لگتے ہیں
"باریں برسی کھٹن گیا تے کھٹ کے لیاندی ایڈ
نویں منگائے باندر لوکاں نوی پوائی کھیڈ"
میں نے اپنی آنکھیں واپس کر دی ہیں
دائروں میں، دریاؤں کے پشتے ٹوٹ گئے ہیں
جس نے نیا سوراخ نکالا نیکی کی (۶)

ان کی نظموں کا رنگ خون کی سیاہی اور سُرخی سے مزین اور ان کی نظموں کا تاثر تلخ اور تشویش انگیز ہے۔ ان کے ہاں تلخی کی شدت کا میلان شکست و ریخت کی جانب جھکتا اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو فنا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس جذباتی دھچکے کے بعد جب آنکھیں کھلتی ہیں تو قاری حیرت و تشویش میں مبتلا کفِ افسوس ملتا ہے کہ ان حقائق سے اب تک آنکھیں چار کیوں نہ کی تھیں۔ ایسے میں ان کی نظم نگاری انسانیت و سماج کی فلاح کا اخلاقی فریضہ سر انجام دیتے ہوئے ان برہنہ حقائق کو سامنے لاتی ہے کہ جن کے باعث معاشرتی گھٹن اور اس سے جنم لینے والی بہیمیت اب تک انسانیت کا گلا گھونٹتی آئی تھی۔ سماجی گھٹن و تشدد کے اس منظر نامے کی صورتیں ان کی بیشتر نظموں میں مواد کی انفرادی ترتیب و تزئین کی صورت غیر روایتی اندازِ فن میں ظاہر ہوتی اور روایتی و تہذیبی حرمتوں کو پاش پاش کرتی ہیں۔

آج میں نے تمام کمزوروں کے لیے موت مانگی
پیپل سے زرد پتے اتار پھینکے
میں نے دیکھا! دن رات ایک ہیں
ہم سفر میں قاتل ہے
اور قیمت میں موت کاغذ سے کم نکلتی ہے
میری جیبوں میں سبز کاغذ تھے
سبز کاغذ پر موت کی مہر (۷)

عباس اطہر کے ہاں داخلی دنیا کا بیان مثالی یا خیالی نہیں بلکہ ادراکِ حقیقت کا ایک ایسا طریقہ ہے کہ جس سے خارجی معروضات کے چہرے کی بجائے ان کی حقیقت اہم ہے۔ لیکن شعری حوالے سے اک حقیقت کا ادراک عام قاری کے بس کی بات نہیں۔ داخلی دنیا میں خارج کی غیر مربوط دنیا خاک نہیں ہوتی بلکہ ایک معنوی رابطے کا سلسلہ دراز کرتی ہے جس میں لامحدود وارداتیں، حقیقتیں، صورتیں اور عکس بنتے بگڑتے رہتے ہیں اور خارجی معروضات حیات و کائنات کا استعارہ بن کر بھرپور معنویت کا اعلامیہ بنتے ہیں۔ ان کی نظمیں محض تصور نہیں بلکہ شدید جذباتی اور نفسیاتی ردِّ عمل کا اظہاریہ ہیں۔ عباس اطہر سے پہلے یہ جذباتی و نفسیاتی شدت راشد اور ان کے عہد کے چند شعرا کے ہاں بھی موجود تھی مگر عباس اطہر اور ان سے پہلے موجود جدید شعرا کے تجربے میں فرق یہ کے

کہ جدید شعرا بالخصوص راشد اور ان کے عہد کے شعرا کا ردعمل جذباتی سے زیادہ نفسیاتی کیفیات کو قبولتے ہوئے شعر سے محسوساتی سطح تخلیق کرنے کی بجائے اپنی نفسیاتی کیفیات کو آئینہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس عمل سے ذہنی کیفیات تو سامنے آتی تھیں شعری تجربہ نہیں۔ اس کے برعکس عباس اطہر کا ردِ عمل جہاں جذباتی شدت کو سنبھالتا ہے وہیں استعارہ بن کر تصور کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ ان کی جذباتی شدت نئے ذہنی محل کی پیدا کردہ ہے جس سے وہ آنکھیں چرانے کی بجائے اسے اپنانے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کا جذباتی مجادلہ انانیت و انفرادیت کے باوجود حیات کو ہر حال میں تسلیم کرنے کے احساس سے جنم لیتا ہے۔ ان کے ہاں موت و حیات، تعمیر و تخریب اور حقیقت و فرار قدم بہ قدم ساتھ چلتے نظر آتے ہیں وہ مادی تہذیب کے مصائب اور نعمتوں کو رد کر کے فرار حاصل کرنے کی بجائے اسے قبول کر کے بشریت کی متھ بدلتی ہوئی اقدار اور انسانی نصیب کے ستاروں کی گردش کو زمینی حقائق کے ساتھ قبولتے ہیں۔ ان کی نظمیں صنفی حیات سے پیدا شدہ زندگی کا رزمیہ ہیں۔ ان کے ہاں حیاتی تجربات اور ذہنی واردات کے اشتراک سے ایک ایسے فنی اسلوب کی پرورش نظر آتی ہے کہ جو موجودہ انسانی صورتحال کے ادراک کا سب سے بڑا آئینہ ہے۔ عباس اطہر کی فنی انفرادیت کے تحت منظرِ عام پر آنے والی نظموں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جس قبولیت اور اشتراک کی ضرورت ہے اس میں مواد کے ہوشربا رشتوں اور بندھنوں کو اولیت حاصل ہے۔ مختلف تفاصیل سے جو احساس بار بار ابھرتا ہے وہ روایتی اخلاقیات پر پورا نہیں اترتا۔ روایتی اخلاقیات سے جو زاویے پیدا ہوتے ہیں اور نقشے مرتب ہوتے ہیں ان کے تلازمے ان تفاصیل سے لگا نہیں کھاتے۔ یہ تفاصیل ان سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں انہیں پرکھنے اور باضابطہ بنا کر قبول کرنے کی دبی دبی توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ ان کے تابع ہوئے بغیر نہ تو ان نظموں کی تازہ فضا میں سانس لیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کیفیات سے فیض یاب ہوا جا سکتا ہے جو ان نظموں کی اجتماعی حیثیت سے مختص ہے:

چاندنی سے نہائے ہوئے درخت کے نیچے
بنجر زمین لیٹی ہوئی ہے اور میں تاریکی اور سناٹے کی سلطنت میں ہوں
نائٹ کلبوں کی روشنی اور شور میں (۸)

عباس اطہر کی نظموں میں نئی، پرانی اور سماجی اقدار باہم دست و گریباں نظر آتی ہیں۔ وہ سماجی و اخلاقی اقدار کے دائرے میں محصور رہ کر بھی اپنی آزادہ روی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا آدرشی پہلو بڑی بے باکی سے معروضی حالات سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے اپنے فوری ردِّ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ چناچہ اقدار کی آویزش میں وہ امتناعی عمل، جو جدید شعرا کے ہاں کارفرما ہے وہ ان کی شاعری میں کم سے کم ہے۔ عباس اطہر پرائیویٹ اور پبلک ورلڈ کی ایک سطح کو قبول کرنے کی بجائے اسے پھیلا کر انسانی شخصیت کے تمام منطقوں تک لے جاتے ہیں۔ ان کی برجستگی میں بے اختیاری کا پہلو پایا جاتا ہے۔ یہ بے اختیاری غزل گو شاعر کی نہیں ایک حساس فنکار کا خلوص اور صداقت ہے، وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اور جس طرح محسوس کرتے ہیں، اس کا اظہار عصری آگہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ چناچہ برجستگی اور بے اختیاری نے ان کی شاعری میں انسانی تجربات کے اظہار میں وہ بے حجابی اور بیباکی پیدا کر دی ہے۔ جس سے ابھی اردو شاعری کنی کتراتی رہی ہے (۹)

مجھے رات کی فصل میں اپنا حصّہ بھی معلوم ہے اور اپنی سزا بھی
میں حق اور حصّہ گنوانا نہیں جانتا
پھر بھی خواہش سے دن رات کے فاصلے پر سمندر کا قیدی ہوں

اونچی پہاڑی پہ تنہا کھڑا ہوں سنو! جو میں کہتا ہوں
لیکن نہیں میں تو برگد کے نیچے اگا ہوں
میری ماں سے کہنا کہ میری گواہی نہ دے (۱۰)

عباس اطہر کے ہاں "دن چڑھے دریا چڑھے" سے شروع ہونے والا شعری انفرادیت کا سلسلہ "کہا سہا" اور "ذکر" میں رفعت اور فنی تکمیل کا احساس دوچند کر دیتا ہے۔ عمومی طور پر شعرا کے پہلے مجموعے کے بعد آنے والے مجموعے تجربات کی گہرائیوں سے فن و فکر کے موتی ڈھونڈنے کی بجائے چند مخصوص تجربات کی میکانکی تکرار بن جاتے ہیں مگر عباس اطہر کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس حوالے سے انیس ناگی کا کہنا ہے:

"جو شاعر مروجہ غزل گو کی طرح قبولیت عام کے آسیب میں ہوتا ہے وہ تجربات میں غواصی کرنے کی بجائے تکرار میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور پھر اس کا ہر مجموعہ ایک ہی تجربے کی میکانکی تکرار بن جاتا ہے۔ اردو شاعری ایسی مثالوں سے معمور ہے۔ اس نہج کے شعرا کے برعکس عباس اطہر نے "دن چڑھے دریا چڑھے" کو "کہا سہا" تک پہنچانے کے لیے راستے کے طور پر استعمال کیا ہے، جنسی تشدد کے وہ استعارے جو پہلے مجموعے میں اپنی واردات کی پہچان اور اظہار کا صیغہ ہیں دوسرے شعری مجموعے میں تصور کی دنیا کو جنم دیتے ہیں، لفظوں اور مثالوں کا ہیجانی مونتاج مشتعل جزباتی پیرایوں میں ڈھل کر نئی طرحیں تخلیق کرتا ہے اور یوں اس کا لسانی اسلوب زیادہ سیّال ہو کر لفظوں اور شے کے فاصلوں کو معدوم کر دیتا ہے۔" (۱۱)

عباس اطہر فنی تشکیل کے عمل میں جس جذباتی صورتحال سے دوچار ہیں وہ ملکی اور بین الاقوامی حدود سے نکل کر پورے عہد میں انسان کشی کے رویے میں جنم لیتی ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا ہزاروں سال پہلے ہبوط آدم کے ساتھ ہی ہابیل و قابیل کی صورت میں ہو گئی تھی مگر بشری انتشار و تخریب کا یہ آرکی ٹائپ ہر دور میں گوں نہ گوں صورتوں میں اپنا اعادہ کرتا ہے۔ خیر و شر، سیاہ سفید، اور زندگی و موت اجالا و ظلمت کی طرح۔ اس میں دو کردار مسلسل برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ عباس اطہر کی نظموں میں مجادلہ، طاقت ور و کمزور، حاکم و محکوم، ظلم و انصاف اور حق و باطل کی صورت میں پنپتا ہے اور فرات کے کناروں سے شروع ہو کر راوی کے تٹ پر آن ٹھہرتا ہے:

پانی تکتے تکتے شام ہوتی تھی
اور فرات کو جانے والے
سر اور ہاتھ کٹا کر واپس لوٹ آئے تھے (۱۲)

عباس اطہر کے فن کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ شعری تجربات کا لسانی ادراک پہلے سے مرتب شدہ لسانی سانچوں میں تشکیل دینے کی بجائے انہیں واقعہ یا احساس کے لہجے سے مرتب کرتے ہیں۔ اس لسانی تشکیل سے جو صورتیں ڈھلتی ہیں وہ اتنی فوری اور شدید ہوتی ہیں کہ تجربہ کی تاثیر ناگزیر ہو جاتی ہے۔ فنی تشکیل کے اس عمل میں عباس اطہر اردو زبان کی مروجہ، مستند اور نستعلیق حرمتوں کو چیلنج کر کے اس میں پنجابی زبان کے لہجے و الفاظ کو اس طرح مدغم کرتے ہیں کہ ان کی نظمیں پنجابی سرزمین کی مٹی کی باس اپنے اندر کھینچ کر شاعری کی ذات، فکر اور فنی تجربات کی ساخت کو اعتبار و تاثیر بخشتی ہیں۔ عباس اطہر نے فنّی تشکیل کا جو بھی پیرائیہ اختیار کیا ہو مگر ان کے تخلیقی تجربات مصنوعی نہیں ہیں۔ انیس ناگی کے بقول:

> "اس کی نظمیں پنجاب کے تناظر کے قریب تر ہو کر اس کو اور حقیقی بناتی ہے اس اعتبار سے نئے شعرا میں عباس اطہر واحد شاعر ہے جس نے صنعتی زندگی سے معمور شہروں میں اپنے جذباتی رویے کو مصنوعی قدروں سے مرصع کرنے کی بجائے اس میں اسی ناتراشدگی اور وفور کو بر قرار رکھا ہے۔ جو ایک ناتراشیدہ، صحت مند اور مصنوعی رویوں سے مبرا توانا شخص میں ہوتا ہے۔" (۱۳)

اس حوالے سے "کہا سہا" کی فصاحت "دن چڑھے دریا چڑھے" سے دوچند ہے۔ عباس اطہر کی نظمیں جو لسانی سلسلے تعمیر کرتی ہیں ان میں لفظوں کی نئی معنویت کا رجحان غالب ہے۔ ان کی نظموں میں ایک خاص جذباتی شدت بہر حال قائم رہتی ہے۔ اس عمل میں عباس اطہر مروجہ شعری و معنوی سانچوں کی مسماری اور نئے معنوی سلسلوں کی تعمیر اس قدر روانی اور آسانی سے کرتے ہیں کہ قاری کو اس سارے سلسلے میں رکاوٹ یا انتشار کا احساس تک نہیں ہونے پاتا۔ عباس اطہر کی شعری انفرادیت زبان کے تابع ہونے کی بجائے زبان کو اپنے شعری اظہار کے تابع کر کے تسکین پاتی ہے۔

اردو شاعری میں عباس اطہر کی نظمیں اسلوبیاتی، فکری اور لسانی ہر سطح پر اچھوتے پن اور انفرادیت کا مظہر ہیں۔ انیس ناگی کے الفاظ میں عباس اطہر کا جذباتی محاورہ اتناہی غیر مروج اور غیر پیمودہ ہے جتنا اس کا لسانی اسلوب۔ (۱۴) دراصل عباس اطہر کی نظمیں نامانوس اور مخفی جزبات و کیفیاتِ انسانی کا اظہاریہ ہیں۔ یہ جزبات و کیفیات وہ ہیں جن کی شعری صورتیں ان کے علاوہ کسی دوسرے اردو شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ عباس اطہر کی فنی انفرادیت اور شعری سرمایہ ابلاغ و تفہیم کے لیے ان کے مخصوص لسانی اسلوب سے قاری کی ہم آہنگی اور موانست کا متقاضی ہے۔ تاکہ ان کی نظموں کی معنوی تشکیل اور تخلیقی تجربات کی غواصی میں قاری کو درپیش مشکلات دور ہو سکیں پڑھنے والا ان کے فکری و شعری سرمائے سے پوری طرح حظ اٹھا سکے۔

عباس اطہر کی نظمیں جدید شاعری میں جدت و انفرادیت کی نمایاں مثال ہیں کہ جہاں وقت، انسان، اس کا ماضی و حال ایک بنیادی تجربے کی صورت میں سامنے آتا ہے اور بشری رویے رسموں کی صورت میں صدیوں پہ محیط انسانی حیات کے مختلف سلسلوں سے پیوست ہیں۔ اپنی نظموں میں بطور فرد عباس اطہر ماضی و حال دونوں سے غیر مطمئن ہمہ گیر انسانی صورتحال کے عکاس ہیں۔ ان کی نظموں میں اجتمائی و انفرادی تنہائی اور وحشت سزا، جرم اسقاطِ حمل، سماجی و سیاسی تشدد کے حقائق در حقیقت زوال پذیر اور مسلسل انہدام سے دوچار وسیع تر انسانی سماج کا احاطہ کرتے ہیں۔ بشر اور اس کے سماج کی زوال پذیری کا جو اساطیری منظر نامہ ان کی نظموں میں نظر آتا ہے وہ نئی انسانی صورتحال کا بلیغ استعارہ ہے۔ اسی بناء پر انیس ناگی یہ سوال کرتے ہیں کہ عباس اطہر کی دہشت پسندی، جرائم سے رغبت کیا وہ منفی قوتیں اور موجودہ حقیقتیں نہیں ہیں جن سے ہم ہر روز ہمکنار ہوتے ہیں۔ (۱۵)

مندرجہ بالا تمام بحث اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کی عباس اطہر کی غیر روایتی نظم نے اردو شاعری کو جس منفرد احساس سے دوچار کیا ہے وہ محض توڑ پھوڑ یا بغاوت سے عبارت نہیں بلکہ عہدِ حاضر کی نفسیاتی، سیاسی، سماجی اور انسانی صورتحال کا دیباچہ ہے۔ انہوں نے اپنے فن کے ذریعے اس عہد کے نظارے کا ایک نیا حسیاتی دائرہ ترتیب دیا ہے۔ اور ان موضوعات کو اقلیم سخن میں داخل کیا کہ جو آج تک ممنوعہ تصور کیے جاتے تھے۔ ان کے ہاں ابتدا تا عہد موجود تک کا تمام تر انسانی نقشہ لامحدود معنویت سے مزین ہو کہ آج کے اانسان کی معاشرتی صورتحال اور اس کی تبدیلی کے لیے صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں اپنے اردگرد بکھرے انسانوں کی حیات میں تصادم اور انتشار کی نت نئی صورتیں مسلسل دستک دیتی اور انسان کے خوابیدہ ضمیر و احساس کو جگانے کی کوشش کرتی ہیں۔

حوالہ جات

1. ڈاکٹر حامد کاشمیری: "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" نئی دہلی، اشاعت دوم، 2010، ص30
2. انیس ناگی: " نیا شعری افق" جمالیات، لاہور، 1969ء، ص116
3. سعادت سعید: (مضمون) "نئی شاعری" مشمولہ: ماہنامہ فانوس، (اشاعتِ خاص) لاہور، مارچ، اپریل، مئی 2012ء، ص238
4. عباس اطہر: "دن چڑھے دریا چڑھے" مشمولہ: "آواز دے کے دیکھ لو" (کلیات) ص56
5. افتخار جالب: "دیباچہ، دن چڑھے دریا چڑھے" از عباس اطہر، مشمولہ "کلیات، "آواز دے کہ دیکھ لو" ص16
6. عباس اطہر: "کہا سہا" مشمولہ: کلیات "آواز دے کہ دیکھ لو" ص۱۲۱
7. عباس اطہر، "دن چڑھے دریا چڑھے" مشمولہ کلیات "آواز دے کہ دیکھ لو" ص24
8. ایضاً، ص80-81
9. انیس ناگی: "نیا شعری افق" ص113
10. عباس اطہر: "کہا سہا" مشمولہ کلیات "آواز دے کہ دیکھ لو"، ص142-144
11. انیس ناگی: "دیباچہ، کہا سہا" از عباس اطہر مشمولہ کلیات "آواز دے کہ دیکھ لو"، ص105
12. عباس اطہر: "کہا سہا" مشمولہ کلیات "آواز دے کہ دیکھ لو"، ص170
13. انیس ناگی: "دیباچہ، کہا سہا" از عباس اطہر مشمولہ کلیات "آواز دے کہ دیکھ لو"، ص108-109
14. انیس ناگی: "نیا شعری افق"، ص134
15. ایضاً، ص135

References

1. Hamid Kashmiri, Dr. *Jadeed Urdu Nazm aur Europi Asrat*. New Delhi. 2nd Edition. 2010. P 30
2. Anees Nagi. *Nia Shaeri Ufq*. Lahore: Jamaliat. 1969. P 116
3. Saadat Saeed. (Article) *Nai Shaeri*. Included: Monthly Fanoos (Special Edition). Lahore. March-May 2012. P 238
4. Abbas Athar. *Kaha Saha*. Incuded: *Awaaz dy Kay Dekh Lo* (Kulliyat). P 56
5. Iftikhar Jalib: (Preface) *Din Charhay Darya Charhay* (Abbas Athar). Incuded: *Awaaz dy Kay Dekh Lo* (Kulliyat). P 16
6. Abbas Athar. *Kaha Saha*. Incuded: *Awaaz dy Kay Dekh Lo* (Kulliyat). P 121
7. Abbas Athar. *Din Charhay Darya Charhay*. Incuded: *Awaaz dy Kay Dekh Lo* (Kulliyat). P 24
8. Ibid. P 80-81
9. Anees Nagi. *Nia Shaeri Ufq*. P 113
10. Abbas Athar. *Kaha Saha*. P 142-144
11. Anees Nagi. (Preface) *Kaha Saha (Abbas Athar)*. Incuded: *Awaaz dy Kay Dekh Lo* (Kulliyat). P 105
12. Abbas Athar. *Kaha Saha*. Incuded: *Awaaz dy Kay Dekh Lo* (Kulliyat). P 170
13. Anees Nagi. (Preface) *Kaha Saha (Abbas Athar)*. P 108-109
14. Anees Nagi. *Nia Shaeri Ufq*. P 134
15. Ibid. P 135